تاویل آیات کا فراہی منہاج

محمد عمر اسلم اصلاحی

علم اصول تاویل ایک مستقل علم ہے۔ تفسیر قرآن کریم میں اس کی ایک خاص اہمیت ہے کیوں کہ اس علم کے بغیر معنی مراد تک پہنچنا ممکن نہیں۔ لیکن اس غیر معمولی اہمیت کے باوجود علامہ حمید الدین فراہیؒ سے پہلے کے علمائے تفسیر کے ہاں علم اصول تاویل پر باقاعدہ کسی کام کا سراغ نہیں ملتا۔ اس موضوع پر جو کچھ کام ہوا بھی ہے وہ محض اصول فقہ کے ذیل میں اور وہ بھی جزوی طور پر، اس کا بہت واضح، جامع اور کلی تصور، تفسیر قرآن کے ایک لازمی جز کی حیثیت سے صرف علامہ فراہی نے پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم علمائے تفسیر کے یہاں فہم معنی قرآن میں شدید اختلاف نظر آتا ہے۔ انہی اختلافات کی وجہ سے متعدد تفسیری مذاہب وجود میں آگئے۔ ان مذاہب کی تفسیری آراء اور ان کے اختلافات کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل ہے کہ قرآن مجید ایک کتاب مبین ہے بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ موزوں ہو کہ یہ ایک پیچیدہ کتاب ہے۔ اور غالباً اسی وجہ سے یہ تاثر عام ہو گیا ہے کہ قرآن مجید کا مطالعہ کرنا اور اس کے معنی و مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرنا صرف اجلۂ علماء کا کام ہے، باقی لوگوں کے لیے بس اس کی سادہ اور سرسری تلاوت ہی کافی ہے۔ چناں چہ انھیں قرآن مجید سے براہ راست استفادہ کے بجائے انہی اجلۂ علماء کے فہم و فتاویٰ پر اعتماد کرنا چاہیے اور جو کچھ ان سے مروی اور منقول ہوا ہے وحی الٰہی کا منشاء سمجھ کر تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس میں غور و فکر کرنے اور اپنی عقل کو استعمال کرنے کی چنداں ضرورت ہے نہ اجازت۔ کیوں کہ دین کی بنیاد نقل پر ہے عقل پر نہیں۔ حالاں کہ جس طرح عقل بلا نقل بے نکیل کا گھوڑا ہے اسی طرح نقل بلا عقل آنکھ پر پٹی باندھ کر گائیڈ کے اشارے پر گاڑی چلانا ہے۔ اور دونوں کا انجام محتاج بیان

نہیں۔ پس نہ تو عقل بلا نقل رہنمائی فراہم کر سکتی ہے اور نہ نقل بلا عقل فائدہ دے سکتی ہے۔

علامہ حمید الدین فراہیؒ نے تاویل آیات کے جو اصول مقرر فرمائے ہیں وہ خود تراشیدہ فلسفہ پر مبنی نہیں ہیں بلکہ یہ زبان کے مستند قواعد سے ماخوذ اور قرآن کے محکم اسالیب سے مستنبط ہیں۔ ان اصولوں کی رعایت زیغ و ضلال سے بچاتی، تفسیر بالرای نفس کی نامحمود ڈگر پر چلنے سے روکتی اور فہم قرآن کا اعلیٰ معیار و میزان فراہم کرتی ہے۔

علامہ فراہیؒ کے نزدیک قرآن مجید قطعی الدلالہ ہے اس لیے اس کی کسی عبارت کا مدلول ایک سے زائد نہیں ہو سکتا۔ ہر آیت کا ایک موقع و محل ہے اور یہی موقع و محل آیت کے مفہوم کا تعین کرتا ہے۔ علامہ فراہیؒ نے ان اصولوں کی روشنی میں خود اپنی تفسیر ''نظام القرآن'' کے نام سے لکھنی شروع کی تھی۔ پہلے چند چھوٹی چھوٹی سورتوں کی تفسیریں لکھیں پھر سورہ بقرہ پر کام کیا لیکن حیات مستعار نے اس سے زیادہ ساتھ نہیں دیا اور افسوس کہ ان کی یہ عدیم النظیر تفسیر تشنۂ تکمیل رہ گئی لیکن انھوں نے جو بھی تفسیری سرمایہ چھوڑا ہے وہ اس میدان میں رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

تفسیر کے دو طریقے معروف ہیں۔ ایک تفسیر بالرای اور دوسرا تفسیر بالماثور، جو تفسیر نبی کریم ﷺ صحابہؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کی طرف منسوب روایت پر مشتمل ہو وہ تفسیر بالماثور ہے اور اس نہج کی نمائندہ تفسیر ''تفسیر ابن جریر'' مانی جاتی ہے۔ اور جس تفسیر میں سلف سے مروی روایات کو تفسیر کی بنیاد قرار دینے کے بجائے براہ راست غور و فکر کا سہارا لیا گیا ہو وہ تفسیر بالرای ہے۔ اس انداز کی سب سے اہم تفسیر امام رازیؒ کی تفسیر ہے۔ ان دونوں ہی تفسیروں کو قبول عام حاصل ہے باوجودیکہ اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ دونوں تفسیریں غث و سمین سے خالی نہیں، علامہ فراہیؒ کی ''تفسیر نظام القرآن'' کو بھی اسی نہج کی تفسیر بالرای قرار دے کر اس پر شدید تنقید بلکہ بہت حد تک اس کی تنقیص کی جاتی ہے۔ حالاں کہ علامہ فراہیؒ نے اپنی کتاب ''التکمیل فی اصول التاویل'' میں جس علم اصول تاویل سے بحث کی ہے اس کی غایت ہی تفسیر بالرای کی تردید بتائی ہے۔ چناں چہ انھوں نے لکھا ہے:

غایة هذاالعلم هو المنع عن التفسیر بالرای.[1] اس علم کی غایت ہی تفسیر بالرای سے روکنا ہے۔

البتہ انھوں نے اس امر کی وضاحت بھی کردی ہے کہ تفسیر بالرای کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ تفسیر بالرای المذموم ۲۔ تفسیر بالرای المحمود

تفسیر بالرای المذموم

تفسیر بالرای المذموم وہ تفسیر ہے جو یکسر آزادانہ غور و فکر کا نتیجہ ہو۔

تفسیر بالرای المحمود

جو تفسیر زبان کے قواعد، آیات کے نظائر، سنت سے واقفیت اور اللہ کی عطا کردہ بصیرت پر مشتمل ہو وہ تفسیر بالرای محمود ہے۔ صحابہؓ کی تفسیریں بھی اسی نوعیت کی ہیں۔ اسی لیے ان کے ہاں تاویل میں اختلاف کے باوجود نتائج عموماً ایک سے نظر آتے ہیں۔ صحابہؓ اور تابعین کی تاویلات و تفسیرات کو کسی طرح بھی تفسیر بالماثور نہیں کہا جاسکتا ورنہ کم از کم ان کے درمیان تو اختلاف کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

علامہ فراہیؒ فرماتے ہیں:

فاعلم أن الصحابة والتابعین رضی الله عنهم أجمعین قد اختلفوا کثیرا فی التاویل مع تقارب خطاهم فلو اخذوا تاویلاتهم عن النبی ﷺ لما اختلفوا لکنهم أخذوها عن علمهم باللسان واقتصارهم علی علمهم بنظائر الآیات وعلمهم بالسنة وعن بصیرة یعطیها الله عباده ولذالک تری أنهم یتقاربون فی المآل۔[2]

جان لو کہ صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین کے درمیان تاویل میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے باوجودیکہ سب کا نہج ایک تھا۔ اگر ان کی تاویلات نبی کریم ﷺ سے ماخوذ ہوتیں تو ان کے درمیان اختلاف نہ ہوتا دراصل ان کی تاویلات مشتمل ہیں زبان کے قواعد، آیات کے نظائر، سنت سے واقفیت اور اس بصیرت پر جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو نوازتا ہے اسی لیے تم دیکھتے ہو کہ وہ نتائج تاویل میں ایک دوسرے سے بہت قریب ہوتے ہیں۔

امام ابن تیمیہؒ کا بھی تفسیر بالرای کے سلسلہ میں یہی نقطۂ نظر ہے۔ فرماتے ہیں:

فاما تفسیر القرآن بمجرد الرای فحرام...... ولهذا تحرّج جماعة من السلف عن تفسیر لاعلم لهم به۔[3]

محض رائے کی بنیاد پر قرآن کی تفسیر حرام ہے...... اور اسی لیے سلف میں سے کچھ لوگوں نے ایسی تفسیر کو نامناسب خیال کیا ہے جس کی بنیاد علم پر نہ ہو۔

پھر آگے مزید فرماتے ہیں:

فهذه الآثار الصحیحة وما شاکلها عن ائمة السلف محمولة علی تحرجهم عن الکلام فی التفسیر بمالا علم لهم به فاما من تکلم بما یعلم من ذالک لغة وشرعا فلاحرج علیه۔[4]

چناں چہ یہ اور اس طرح کے دوسرے آثار صحیحہ جو ائمہ سلف سے منقول ہیں اس بات پر محمول کیے جائیں گے کہ دراصل انھوں نے ان لوگوں کے لیے تفسیر کے باب میں لب کشائی کو نامناسب خیال کیا ہے جنھیں علم تفسیر کا سرے سے کوئی علم ہی نہیں۔ رہے وہ لوگ جن کو اس باب میں زبان و شریعت کا علم حاصل ہے تو ان کے کلام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

ابتداء قرآنی آیات کی تاویل کا انداز و اسلوب یہی تھا کہ لوگ کلام الٰہی پر غور و تدبر کرتے تھے۔ الفاظ کے معانی کے تعین میں کلام عرب میں ان کے استعمالات دیکھتے تھے، قرآن مجید میں ان کے نظائر تلاش کرتے تھے اور سیاق وسباق کی روشنی میں الفاظ و آیات کا مفہوم متعین کرتے تھے لیکن بعد میں جب اہل بدعت نے اپنی خواہشات کے مطابق آیات کی تاویل کرنی شروع کردی تو اہل سنت نے اسے ممنوع اور تفسیر بالماثور کو لازم قرار دیا۔ اہل سنت کی یہ خواہش اور کوشش بلاشبہ فتنہ کے سدباب کے لیے تھی اور یقیناً قابل ستائش تھی کیوں کہ اس وقت فتنہ کے سد باب کے لیے ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ تفسیر بالرای المحض سے روکنے کا یہ کوئی موثر ذریعہ نہیں تھا اسی لیے ایک دوسری مصیبت یہ کھڑی ہوگئی کہ تفسیر بالماثور کے نام سے ایسی

تفسیریں وجود میں آگئیں جو ضعیف اور موضوع روایات کا مجموعہ بن کر رہ گئیں۔ ایک فتنہ کے سد باب کی کوشش کی گئی کہ دوسرا فتنہ وجود میں آگیا۔ اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ تاویل آیات کے وہ اصول منضبط نہیں تھے جنھیں سلف عملاً برتتے تھے۔ صحابہؓ اور تابعینؒ براہ راست قرآن مجید پر تدبر فرماتے تھے اور جو کچھ سمجھتے اس کا برملا اظہار کرتے تھے۔[۵]

تدبر فی القرآن واجب ہے

علامہ فراہیؒ کے نزدیک تدبر فی القرآن واجب ہے اور اس کے حق میں انھوں نے متعدد دلائل بھی دیے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر تدبر فی القرآن کا صریح حکم دیا ہے۔[۶]

۲۔ اللہ تعالیٰ نے تدبر، استدلال اور غور وفکر کے مواقع کی وضاحت تو فرمائی ہے لیکن نتائج تدبر واستدلال کو واضح نہیں فرمایا۔ اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص کو جو اہل ہو غور وفکر کے بعد اخذ نتائج کا حق ہے۔

۳۔ نبی کریم ﷺ جس طرح معلم شرائع بنا کر بھیجے گئے تھے اسی طرح معلم حکمت بھی بنا کر بھیجے گئے تھے اور تعلیم حکمت عقل کے استعمال اور غور فکر کے بغیر ممکن نہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے حکمت کی تعلیم بھی دی ہے، ترغیب بھی دی ہے اور حصول حکمت کی راہوں اور ذرائع کی طرف رہنمائی بھی فرمائی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کبھی کبھی لوگوں کے سامنے ایک مسئلہ رکھتے اور اس پر ان کو اپنی اپنی رائے کے اظہار کا موقع دیتے، بخاری شریف کی ایک روایت ہے:

عن ابن عمر عن النبی ﷺ قال إن من الشجر شجرة لا يسقط ورقها وانها مثل المسلم، حدّثوني ماهي؟ قال فوقع الناس في شجر البوادی

قال عبد الله فوقع في نفسي أنها النخلة فاستحييت ثم قالوا حدّثنا يارسول الله ماهي؟ قال هي النخلة۔[۷]

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ ایک درخت ہے جس کے پتے جھڑتے نہیں۔ اور وہ مسلم کے مانند ہے۔ لوگو! بتاؤ وہ کون سا درخت ہے؟ راوی فرماتے ہیں کہ لوگ صحرائی درختوں کا ذکر کرنے لگے۔ عبداللہ فرماتے ہیں کہ میرا ذہن کھجور کے درخت کی طرف گیا لیکن میں شرم کی وجہ سے کہہ نہیں سکا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ فرمایئے کہ وہ کون سا درخت ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ بہت زیادہ سوال کرنے سے بھی منع فرماتے تھے۔ اس ممانعت کے پیچھے من جملہ دیگر مصالح کے یہ مصلحت بھی ہوتی تھی کہ اس سے لوگوں میں غور وفکر کا داعیہ پیدا ہوگا۔ بخاری شریف ہی کی ایک اور روایت ہے:

عن ثابت بن أنس رضی الله عنه قال: نهينا في القرآن أن نسأل النبی ﷺ فكان يعجبنا أن يجي الرجل من اهل البادية العاقل فيسأله ونحن نسمعه– إلى اخر الحديث۔[۸]

علامہ فراہی فرماتے ہیں کہ ممانعت سے غالباً ان کا اشارہ اس آیت کی طرف تھا کہ يا يها الذين امنوا لا تسألوا عن أشياء (المائدہ:۱۰۱)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی قرآنی آیات کے معانی ایک دوسرے سے پوچھتے تھے اور خود بھی ان پر غور وتدبر کرتے تھے۔ مثلاً حضرت عمرؓ نے لوگوں سے پوچھا کہ سورہ نصر میں کس چیز کی طرف اشارہ ہے؟ تو سب خاموش رہے البتہ حضرت عبداللہ ابن عباس بولے اور حضرت عمرؓ نے ان کے جواب کی تصویب فرمائی۔[۹]

ایک اعتراض اور اس کا جواب

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ علم بیان، علم نظر اور علم استدلال سے دل چسپی اور انہماک بدعت ہے کیوں کہ صحابہؓ کا جنھیں دین کا فہم سب سے زیادہ تھا، اس میں انہماک نظر نہیں آتا۔

علامہ فراہیؒ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ صحابہؓ کو جو بصیرت حاصل تھی اور ان کا

قرآنی علم جتنا گہرا تھا اس کے ہوتے ہوئے انھیں علم بیان اور اس کے فروغ میں انہماک کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ان کی بالغ نظری اور ان کا ذوق سلیم ان کی رہنمائی کے لیے کافی تھا۔ لیکن بعد کے لوگ جو اس جوہر سے خالی ہیں ان کے لیے اصول ناگزیر ہیں ورنہ یا تو وہ اپنی عقل کا آزادانہ استعمال کریں گے اور قرآنی آیات کی من مانی توجیہ کریں گے یا پھر عقل کے استعمال پر یکسر پابندی لگادی جائے گی اور غور وفکر کا وہ دروازہ بند ہوجائے گا جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے کھولا ہے۔[۱۰]

اصول تاویل

وہ اصول جو فہم قرآن میں مددگار ثابت ہوتے ہیں، اصول تاویل کہلاتے ہیں اور یہ دوطرح کے ہیں۔ ایک تو وہ جو تاویل کے باب میں کج روی سے حفاظت کرتے ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو ان کی حکمتوں کی جانب رہنمائی کرتے ہیں جن پر کلام الٰہی مشتمل ہے۔ اور یہ دونوں طرح کے اصول معلوم ہوں گے نظم قرآن پر غور وفکر کرنے سے۔ کیوں کہ نظم وہ حبل متین ہے جسے تھامنے والا زیغ وضلال سے محفوظ رہتا ہے اور یہ وہ سراج منیر ہے جو حکمتوں کے تمام پہلوؤں کو منور ومجلی کردیتا ہے، ترتیب آیات میں یہی حکمتیں ملحوظ ہیں۔[۱۱]

تاویل اور تحریف میں فرق

کلام کو اسی مفہوم پر محمول کرنا جس کی نقلاً یا عقلاً گنجائش ہو تاویل کہلاتا ہے۔ اس کی ضد تحریف ہیں۔ یعنی تحریف نام ہے کلام کو اس مفہوم پر محمول کرنا جس کی نقلاً یا عقلاً گنجائش نہ ہو۔ تاویل مطلوب ومحمود ہے جب کہ تحریف ممنوع ومبغوض۔ تاویل کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کے لیے یہ آیت ملاحظہ ہو:

ورفع ابویه علی العرش وخروا له سجدا وقال یا ابت هذا تاویل رویای من قبل قدجعلها ربی حقا. (سورہ یوسف:۱۰۰)	اس (یوسف) نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور سب ان کے لیے سجدے میں گرپڑے اور اس نے کہا۔ اے میرے باپ! یہ ہے میرے پہلے خواب کی تعبیر۔ میرے رب نے اسے سچ کردکھایا۔

اور تحریف کے حقیقی مفہوم کو جاننے کے لیے ملاحظہ ہو یہ آیت:

من الذین هادوا یحرفون الکلم عن مواضعه. (النساء:۴۶)	یہود میں سے ایک گروہ الفاظ کو ان کے موقع محل سے ہٹا دیتا ہے۔

تاویل کی غلطی کا بنیادی سبب

حقیقت یہ ہے کہ جس کسی نے کوئی عقیدہ قائم کیا اسے اپنے اس عقیدہ کے حق میں جہاں سے کوئی دلیل ملی بے تکلف لے لی اس کے بعد قرآن مجید کی طرف دیکھا۔ اب اگر اسے نظر یہ آیا کہ قرآن مجید بظاہر اس کے عقیدہ کے موافق نہیں ہے تو اس نے قرآن کی تاویل اپنے عقیدے کے مطابق کر ڈالی۔ اس طرح بہت ساری ایسی تاویلات تفسیروں میں در آئیں جن کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ سب سے بڑی غلطی ہے جو تاویل کے باب میں روا رکھی گئی ہے اور اس غلطی کے لیے راہ ہموار کی ہے بلا اصول وضوابط آزادانہ غور وفکر نے۔[۱۲]

کسی آیت کی ایک ہی تاویل

صحابہؓ کے یہاں ان کے تقویٰ، زبان کے علم اور شان نزول سے راست واقفیت کے سبب قرآن کی کسی آیت کی تاویل ایک ہی ہوتی تھی۔ اسی لیے قرآنی آیات کے معنی و مفہوم کے سلسلہ میں ان کے سوالات اور استفسارات بھی کم ہی ملتے ہیں اور آیات کی تفسیریں بھی ان سے بہت زیادہ منقول نہیں ہیں۔ اور جہاں تک تابعینؒ کا تعلق ہے تو چوں کہ شان نزول کے تئیں ان کی واقفیت صحابہؓ کی طرح راست معلومات پر مبنی نہیں تھی اس لیے انھوں نے تاویل میں نظائر اور آثار صحابہؓ کو بنیاد بنایا۔ پھر جب فلسفہ کا ظہور ہوا اور عقائد میں اختلاف رونما ہوا تو لوگ آزاد خیالی کا شکار ہوگئے نتیجۃً کئی فرقے وجود میں آگئے اور ہر فرقہ نے ضعیف اور اسرائیلی روایات میں سے اپنی پسند کی روایات لے لیں۔ اس طرح وجوہ تاویل کی کثرت ہوئی اور معاملہ بایں جارسید کہ ایک واضح حقیقت مشتبہ ہوگئی،

تفسیر کے راستے تاریک ہوگئے اور فہم قرآن کا دروازہ بند ہوگیا۔۱۳

علامہ فراہیؒ کے نزدیک کسی آیت کی تاویل ایک ہی ہوگی۔ ایک سے زائد تاویلات نہیں ہوسکتیں۔ ان کا خیال ہے کہ صحیح تاویل تک پہنچنے کے لیے متعدد پہلوؤں کو سامنے رکھنا ہوگا۔ مثلاً قرآن کی تاویل قرآن سے کرنی ہوگی، نظم کلام کی رعایت رکھنی پڑے گی۔ موقع محل سے معنی کا تعین کرنا ہوگا، الفاظ اور مختلف الوجوہ معانی پر غور و تدبر کرنا ہوگا، سورتوں کے مضامین کی ترتیب کے مختلف طریقوں کی حکمتوں کو سمجھنا ہوگا، الفاظ و معانی اور نفی واثبات کی مختلف جہات پر نظر رکھنی ہوگی، اسم، صفت اور فعل کے اطلاق کا فرق سمجھنا ہوگا۔ افراد کے بجائے صفات کے حکم کی حکمتوں کو جاننا پڑے گا، مطلق اور جامع کلمات کے متعلقات پر نظر رکھنی ہوگی، حقیقت مطلقہ اور حقیقت مصطلحہ کا فرق سمجھنا ہوگا، وجوہ کلام اور تاویل کلام کو جاننے کی کوشش کرنی ہوگی، بیان اور ایہام کو سمجھنا ہوگا، محذوفات پر نظر رکھنی ہوگی، کہیں کہیں کلام ظاہر اور محسوس کے خلاف مفہوم متضمن ہوتا ہے اسی طرح کسی حکم پر اضافہ بسا اوقات اس کی تکمیل ہوتی ہے ان سب باتوں کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ مزید برآں وجوہ نظم اور مواقع تدبر کو نگاہ میں رکھنا ہوگا۔ تاویل آیات کے یہ سب لوازم ہیں۔ علامہ فراہیؒ نے تاویل آیات کے ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔۱۴ تفصیل کے طالب ان کی کتاب ''التکمیل فی اصول التاویل'' سے رجوع کریں۔ البتہ انھوں نے اصول تاویل کو تین اساسی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ بنیادی اصول ۲۔ ترجیحی اصول ۳۔ باطل اصول

بنیادی اصول

بنیادی اصول سے مراد وہ اصول ہیں جن کی حیثیت اصل الاصول کی ہے، جن کے بغیر آیات کی صحیح تاویل تک رسائی ممکن ہی نہیں۔ یہ اصول چار ہیں۔

۱۔ نظم کلام اور سیاق وسباق کی رعایت۔

۲۔ شاذ معانی سے اجتناب۔

۳۔ قرآن کی تفسیر قرآن سے۔

۴۔ خطاب اور مخاطب کا تعین۔

نظم کلام کی رعایت

نظم کلام فہم قرآن میں ایک فیصلہ کن عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کلام میں الفاظ، حذف، مقدر اور تعریض میں اشتراک ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک سورہ میں متعدد دلالتوں کی جہت سے جو مختلف اسالیب استعمال ہوتے ہیں، ان کے درمیان بھی ایک اشتراک ہوتا ہے۔ مثلاً امر، استفہام، اور عطف کی دلالتیں ہر چند کہ مختلف ہوتی ہیں لیکن ان سب میں ایک خاص قسم کا اشتراک ہوتا ہے۔ الفاظ کی ان ساری دلالتوں اور بیان کے ان سارے سوتوں کو جان لینے کے بعد یہ سمجھنا آسان ہوجاتا ہے کہ کسی خاص جگہ پر اصل مراد کیا ہے؟

کلام میں ایسے اجزاء بھی ہوتے ہیں جن میں مختلف معانی کا احتمال ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ سارے معانی بیک وقت درست نہیں ہوسکتے۔ ایسے مواقع پر معنی مراد تک پہنچنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کہ کلام کا سیاق وسباق دیکھا جائے اور سیاق کلام جس مفہوم کو اختیار کرنے کی اجازت دے اسی کو لیا جائے۔ علامہ فراہیؒ کے نزدیک تاویل کا بیش تر اختلاف نتیجہ ہے اس بات کا کہ لوگوں نے آیات کے اندر نظم کا لحاظ نہیں رکھا اگر نظم کلام ظاہر ہوتا اور سورہ کا عمود یعنی مرکزی مضمون واضح طور پر سب کے سامنے ہوتا تو تاویل میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہوتا۔۱۵ ''نظم کلام ہی کلام کے صحیح سمت کو متعین کرنے والی واحد چیز ہوسکتی ہے۔ اس سے اہل بدعت وضلالت اور اصحاب تحریف کی کج رویوں کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ اور خدا کا کلام ان کی غلط تاویلوں اور تحریفوں سے محفوظ رہ سکتا ہے''۔۱۶

شاذ معانی سے اجتناب

قرآن مجید عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔ اس کی زبان فصاحت وبلاغت کا اعلیٰ

نمونہ ہے اسی طرح اس کے معانی مطالب میں بھی غایت درجہ بلندی پائی جاتی ہے۔ جو کلام ان خصوصیات کا حامل ہو وہ فصیح، معروف، اور واضح کو چھوڑ کر شاذ، منکر اور غریب الفاظ کا استعمال کیونکر کرسکتا ہے؟ اس لیے قرآنی الفاظ کے وہی معنی لینے چاہئیں جو معروف اور ثابت ہوں۔ اس اہم اور بنیادی اصل کو سامنے نہ رکھنے کی وجہ سے ہمارے علمائے تفسیر نے بعض الفاظ کے وہ معنی بیان کردیے ہیں جو نہ صرف یہ کہ حقائق کے خلاف ہیں بلکہ وہ ذوق سلیم پر گراں گزرتے ہیں اور طبیعت بھی انھیں قبول کرنے سے ابا کرتی ہے۔ مثلاً ایک آیت ہے ''إن تتوبا إلى الله فقد صغت قلوبكما'' (تحریم:۴) عام طور پر مفسرین نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ ''اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرتی ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے کیوں کہ تمہارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں''۔ [۱۷] علامہ فراہیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں مفسرین نے لفظ ''صغو'' کے مفہوم کو سمجھنے میں غلطی کی ہے اور اس لفظ کو ایک ایسا معنی پہنادیا ہے جس کی کلام عرب میں کوئی نظیر نہیں۔ گویا معروف کو چھوڑ کر غیر معروف کا سہارا لیا ہے فرماتے ہیں:

> ''میل ایک کلی مفہوم ہے اس کے تحت عربی میں بہت سے الفاظ آتے ہیں۔ مثلاً زیغ، جور، ارعواء، حیادہ، انحراف'' وغیرہ لیکن یہ سب ''میل عن الشئ'' یعنی کسی چیز سے ہٹنے اور پھرنے کے لیے آتے ہیں۔ پھر اسی کے تحت ''فَی، توبہ، التفات اور صغو'' دیگر الفاظ ہیں جو سب کے سب ''میل الی الشئ'' یعنی کسی چیز کی طرف مائل ہونے اور جھکنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں...... اس نکتہ کے واضح ہوجانے کے بعد عربی زبان کے ایک عالم سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہ سکتی کہ ''صغت قلوبکما'' کے معنی ''انابت قلوبکما ومالت الی اللہ ورسولہ'' کے ہوں گے۔ کیوں کہ ''صغو'' کا لفظ کسی شے کی طرف جھکنے کے لیے آتا ہے، کسی شے سے مڑنے اور ہٹنے کے لیے نہیں آتا''۔ [۱۸]

اس کے علاوہ آیت کا اسلوب بھی اس مفہوم کی نفی کرتا ہے۔ علامہ فراہیؒ اس آیت کے اسلوب سے بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''اہل عرب کے متعلق یہ بات معلوم ہے کہ وہ کلام میں حشو و زوائد سے بہت بچتے تھے اور بات کے جتنے حصہ کا حذف ممکن ہو اس کے ذکر کو بلاغت کے خلاف سمجھتے تھے۔ یہ فن بلاغت کا ایک نہایت وسیع باب ہے جس کی تفصیلات طویل ہیں ہم یہاں اس کے صرف اتنے حصہ پر بحث کرنا چاہتے ہیں جتنا ''اِن'' شرطیہ اور ''قد'' سے تعلق رکھتا ہے''۔

پہلے ہم بعض مثالیں نقل کریں گے تاکہ جس محذوف کو ہم روشنی میں لانا چاہتے ہیں اس کی طرف اشارہ کرسکیں۔ قرآن مجید میں ہے:

إن تستفتحوا فقد جاء كم الفتح. (الانفال:۱۹)
اگر تم فتح چاہتے ہو تو لو فتح آگئی۔

دوسری جگہ ہے:

وان یکذبوک فقد کذبت رسل من قبلک (الفاطر:۴)
اگر یہ تم کو جھٹلاتے ہیں تو کچھ تعجب نہیں تم سے پہلے دوسرے انبیاء کو بھی جھٹلایا گیا ہے۔

ایک جگہ اور ہے:

إلا تنصروه فقدنصره الله (التوبۃ:۴۰)
اگر تم اس کی مدد نہ کرو گے تو پرواہ نہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اس وقت مدد کی جب......

علامہ فراہیؒ نے ان کے علاوہ اور بھی کئی مثالیں دی ہیں اور ایک جاہلی شاعر کا کلام بھی پیش کیا ہے۔ اس کے بعد آگے لکھتے ہیں۔

''ان تمام مثالوں پر غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ اس طرح کے

اسالیب میں "قد" کے بعد جو جملہ آتا ہے وہ اس امر کی آسانی اور سہولت کو بیان کرتا ہے جو "اِن" کے بعد کہی جاتی ہے۔ یعنی اسلوب کے محذوف کو اگر کھول دیا جائے تو تقدیرِ کلام یوں ہوتی ہے کہ اگر ایسا ایسا ہوا تو کچھ ہرج نہیں یا کوئی اشکال نہیں یا یہ معمولی بات ہے کیوں کہ ایسا ایسا ہو چکا ہے۔ بس اس آیت کی تاویل یہ ہوگی کہ اگر تم پیغمبر کی رضا جوئی کے لیے خدا سے توبہ کرو جس طرح پیغمبر تمہاری دل داری فرماتا ہے تو یہی بات تم سے متوقع ہے کیوں کہ تمہارے دل تو اس کی طرف مائل ہی ہیں"۔ ۱۹

قرآن کی تفسیر قرآن سے

معنی مراد تک پہنچنے کے لیے ایک اعلیٰ تفسیری اصول۔ "تفسیر القرآن بالقرآن" ہے اس حقیقت کو تسلیم تو تقریباً سارے ہی مفسرین نے کیا ہے لیکن عملاً برتا بہت کم لوگوں نے ہے حالاں کہ یہ حقیقت کسی سے مخفی نہیں کہ قرآن مجید ایک ہی معاملہ کو مختلف مواقع پر موقع محل کے لحاظ سے الگ الگ انداز میں بیان کرتا ہے۔ کہیں اس کا ایک پہلو بیان ہوتا ہے تو دوسری جگہ اس کا دوسرا پہلو۔ اسی طرح کہیں اجمال ہوتا ہے تو کہیں تفصیل اور کہیں تفصیل مزید، مثلاً ایک آیت ہے "وسبح بالعشی والابکار" (آل عمران:۴۱) اس آیت میں "تسبیح بالعشی والابکار" کی وسعتوں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس حکم کی تمام آیات سامنے رکھی جائیں اب دیکھیے ایک دوسری جگہ ہے۔ "وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل غروبها ومن اناء اللیل فسبح واطراف النهار لعلک ترضی" (طٰہٰ:۱۳۰) ایک جگہ اور ہے۔

"وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل الغروب ومن اللیل فسبحه وأدبار السجود" (ق:۳۹-۴۰) اسی طرح ایک جگہ ہے

"وسبح بحمد ربک حین تقوم ومن اللیل فسبحه وإدبار

النجوم" (الطور:۴۸-۴۹) اور ایک مقام پر ہے۔

"فسبحٰن الله حین تمسون وحین تصبحون وله الحمد فی السمٰوت والارض وعشیا وحین تظهرون" (الروم:۱۷-۱۸) اسی طرح ایک جگہ یوں ہے۔

"واقم الصلوٰة طرفی النهار وزلفا من اللیل إن الحسنات یذهبن السیئات" (ہود:۱۱۴) اور ایک جگہ اس طرح ہے۔

"اقم الصلوٰة لدلوک الشمس إلی غسق اللیل وقرآن الفجر إن قرآن الفجر کان مشهودا ومن اللیل فتهجد به نافلة لک عسی ان یبعثک ربک مقاما محمودا" (الاسراء:۷۸-۷۹) اگر ان ساری آیات کو سامنے رکھا جائے تو "وسبح بالعشی والابکار" کی وسعتوں کو سمجھنے میں کوئی زحمت نہیں ہوگی۔

خطاب اور مخاطب کا تعین

قرآن مجید دراصل اللہ تعالیٰ کا ساری انسانیت سے ایک خطاب ہے۔ اس نے اس میں کہیں تو صرف اہلِ ایمان کو خطاب کیا ہے اور کہیں صرف اہلِ کفر وشرک سے، کہیں صرف اہلِ نفاق سے تو کہیں اہلِ ایمان اور اہلِ نفاق دونوں سے۔ اسی طرح کہیں اہلِ ایمان اور اہلِ کفروشرک دونوں سے۔ مطالعہ قرآن کے وقت اگر خطاب اور مخاطب کو مدنظر رکھا جائے تو کلام کے رخ کو متعین کرنے میں سہولت ہوگی۔ اس سے یہ پتہ چلے گا کہ کہاں تسلی وتثبیت کا پہلو ہے اور کہاں زجر وتوبیخ کا۔ کلام کا کون سا حصہ رافت پر مبنی ہے اور کون سا غضب پر۔ کہاں وعدہ ہے اور کہاں وعید، وغیرہ، مثلاً سورہ عبس کی ابتدائی آیات ہیں جن کی تفسیر کرتے ہوئے عام طور سے مفسرین نے لکھا ہے کہ اس میں نبی کریم ﷺ پر نابینا صحابی عبد اللہ ابن ام مکتومؓ کے ساتھ بے اعتنائی برتنے اور ان سے ترش روئی سے پیش آنے کی وجہ سے عتاب ہے حالاں کہ صحیح بات یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے کوئی ایسی غلطی نہیں کی تھی جس کی وجہ سے آپ پر عتاب ہوتا۔ بس شوق دعوت وتبلیغ میں ان حدود کا

اس حد تک پاس نہ ہو سکا تھا جو آپ کی پیغمبرانہ شان کا تقاضا تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو تنبیہ فرمائی۔ لیکن اس تنبیہ میں بھی اگر کوئی دیدۂ بینا جھانک کر دیکھے تو آپ کے تئیں اللہ تعالیٰ کی رافت ورحمت اور سرداران قریش پر عتاب بہت واضح طور پر نظر آئے گا۔

اس نکتہ کی وضاحت علامہ فراہیؒ اس طرح فرماتے ہیں:

"ان آیات کے اندر محمد ﷺ کو آپ کے بلند منصب کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ آپ مغروروں اور سرکشوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے کوئی ایسی شکل اختیار نہ کریں جو آپ کے رتبہ سے فروتر ہو۔ اگر یہ مشرکین اور ضدی لوگ ایمان نہیں لاتے تو آپ ان سے بے پروا ہو کر صرف ان مومنین کے ساتھ مشغول رہیں جو آپ کی توجہ کے اصلی مستحق ہیں۔ یہ مضمون مقتضی ہوا کہ یہاں مختصراً اس چیز کی رفعت شان بھی بیان کر دی جائے جو آپ پر نازل کی گئی ہے تا کہ یہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ جو لوگ ایسی گرانمایہ نعمت سے منہ پھیر رہے ہیں وہ ہرگز اس بات کے سزاوار نہیں ہیں کہ ان کو زیادہ اہمیت دی جائے"۔[20]

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا اس باب میں نقطۂ نظر یہ ہے کہ:

"اس میں اگرچہ خطاب بظاہر نبی ﷺ سے ہے لیکن عتاب کا رخ تمام تر قریش کے فراعنہ ہی کی طرف ہے"۔[21]

ترجیحی اصول

ترجیحی اصول سے مراد علامہ فراہیؒ کے نزدیک ایسے اصول ہیں جن کی مدد سے مختلف احتمالات کی صورت میں صحیح معنی تک رسائی میں سہولت ہوتی ہے۔ اور وہ پانچ ہیں۔

۱۔ کلام کی مختلف توجیہات کی امکانی صورت میں اس مفہوم کو ترجیح حاصل ہوگی جو موقع محل اور عمود کلام سے زیادہ مناسبت رکھتا ہو۔ ہر کلمہ کے کچھ اطراف وجہات ہوتے

ہیں جن کی حیثیت معانی کی ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر امر واقعہ اور قصہ کے بھی کچھ اطراف و جہات ہوتے ہیں۔ ان کی رعایت کے بغیر اس امر واقعہ یا قصہ کو صحیح طور سے سمجھنا مشکل ہے۔ مثلاً کامل یکتائی کی صفت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر مختلف اسماء کے ساتھ متعدد مقامات پر ہوا ہے اور ترتیب میں ہر جگہ یکسانیت بھی نہیں ہے۔ مثلاً اس کی ایک صفت "عزیز" ہے اس کا استعمال سورہ بقرہ میں متعدد مقامات پر ہوا ہے اور ہر جگہ اس کے ساتھ "الحکیم" کی صفت آئی ہے۔[22] لیکن بعض مقامات پر اس صفت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ایک دوسری صفت "ذوانتقام" آئی ہے۔[23] اور کہیں اس کے ساتھ "العلیم" کا استعمال ہوا ہے۔[24] ان تمام جگہوں پر صفت "العزیز" پہلے ہے۔ دیگر صفات اس کے بعد آئی ہیں۔ لیکن سورہ حشر میں دیکھیے۔ یہاں یہی صفت درمیان میں آئی ہے۔ اس سے پہلے "المھیمن" اور اس کے بعد "الجبار" ہے۔[25] اسی طرح سورہ جمعہ میں بھی یہ صفت درمیان میں آئی ہے۔ اس سے پہلے "القدوس" اور اس کے بعد "الحکیم" ہے۔[26] ترتیب میں اس طرح کے اختلافات کی کچھ حکمتیں ہیں جنھیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اور یہ لحاظ تدبر فی القرآن کے بغیر ممکن نہیں۔ چناں چہ جو شخص قرآن مجید پر تدبر نہیں کرتا وہ ان کلمات کے موقع محل اور ان کی جہتوں کے فہم سے قاصر رہتا ہے۔ اس لیے اس پر کلام کے بے شمار گوشے مخفی رہ جاتے ہیں۔

۲۔ کلام میں اگر متعدد احتمالات ہوں تو اس احتمال کو ترجیح حاصل ہوگی جس کی نظیر قرآن مجید میں موجود ہو۔ اور جس کی نظیر قرآن مجید میں موجود نہ ہو اسے ترک کر دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر دو معانی کا احتمال ہو اور دونوں کی نظیریں قرآن مجید میں موجود ہوں تو اسی احتمال کو ترجیح حاصل ہوگی جو نظم کلام کے مطابق ہو۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ واعلموا أن الله يحول بين المرء وقلبه وأنه إليه تحشرون (الانفال:۲۴) اس آیت کی دو تاویلیں ہو سکتی ہیں۔

ایک تاویل تو یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ تمہارے رازہائے سربستہ سے واقف ہے۔

اور دوسری تاویل یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ آدمی کو اس کے ارادے سے روک دیتا ہے۔

پہلی تاویل کی نظیر بھی قرآن مجید میں موجود ہے اور نظم کلام بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ کیوں کہ ''تحشرون'' کا تصور دل میں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ پیدا کرتا ہے۔ اسی لیے متعدد مقامات پر اس کا ذکر تقویٰ کے ساتھ ہوا بھی ہے۔ مثلاً:

واتقوا اللہ واعلموا أنکم إلیہ تحشرون (البقرۃ:۲۰۳)

اقیموا الصلوٰۃ واتقوہ وھو الذی إلیہ تحشرون (الانعام:٦)

واتقوا اللہ الذی إلیہ تحشرون (المجادلۃ:۹)

اور تقویٰ پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے تصور علم سے۔ تو گویا بات یہاں یہ کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو کیوں کہ وہ تمہارے راز ہائے سربستہ سے بخوبی واقف ہے اور تمہیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ یہ ایک جہت ہوئی یا یوں کہیے کہ اس کا ایک مفہوم یہ ہوا جس کی نظیر بھی قرآن مجید میں موجود ہے اور یہ نظم کلام سے ہم آہنگ بھی ہے۔

رہی دوسری تاویل تو نظیر اس کی بھی قرآن مجید میں موجود ہے چناں چہ ارشاد ہوا۔

وحیل بینھم وبین ما یشتھون (سبا:۵۴) لیکن سیاق کلام اس معنی کی تائید نہیں کرتا۔

۳۔ اگر معنی کسی ایسی عبارت کا مقتضی ہو جو کلام میں مذکور نہیں تو یہ مرجوح ہوگا، علامہ فراہیؒ نے اس کی کوئی مثال نہیں دی ہے بس یہ اشارہ کر کے چھوڑ دیا ہے کہ حضرت عائشہؓ اور امام شافعیؒ نے التغنی بالقرآن کے باب میں اسی اصل سے استدلال کیا ہے۔

۴۔ ہمیشہ کلام میں احسن پہلو کو ترجیح حاصل ہوگی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو احتمال معالی امور اور مکارم اخلاق کے شایان شان ہو، دل اسے بلا تامل قبول کرتا ہو، محکمات قرآنی کے موافق ہو، اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ حسن ظن پر مبنی ہو اور عربیت کے لحاظ سے زیادہ نمایاں ہو وہ قابل ترجیح ہوگا۔

اس ضمن میں علامہ فراہیؒ نے امام ابن جریرؒ کا حوالہ دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ امام ابن جریرؒ روایات کی طرف شدت اعتنا کے باوجود احسن پہلو کو ترجیح دیتے تھے اور اس کے لیے اگر روایت کو نظر انداز بھی کرنا پڑے تو وہ اسے نظر انداز بھی کر دیتے تھے۔ اس کے بعد ایک مثال پیش کی ہے۔

سورہ یوسف کی ایک آیت ہے۔ ''**لقد کان فی قصصھم عبرۃ لأولی الالباب**'' (یوسف:۱۱۲) اس آیت کی تاویل میں امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں:

> ''یہاں اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ یوسف اور ان کے بھائیوں کے قصوں میں اہل خرد کے لیے سامان عبرت ہے۔ دیکھیے کہ قرآن نے پہلے حضرت یوسف کے کنویں میں ڈالے جانے کا قصہ بیان کیا پھر بازار مصر میں ان کے سستے داموں فروخت کیے جانے کا ذکر کیا۔ پھر ان کی جلاوطنی اور حبس طویل کی داستان سنائی اس کے بعد ان کے ملک مصر کے حکمراں بننے کا ذکر کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک طویل عرصے کے بعد ان کو، ان کے والدین کو اور ان کے بھائیوں کو جو اکٹھا کر دیا اس کا بیان کیا۔ یہ سب کچھ سنانے کے بعد اللہ تعالیٰ مشرکین قریش سے کہہ رہا ہے کہ اے مکہ والو! ان قصوں میں تمہارے لیے سامان عبرت ہے بشرطیکہ تم میں عبرت پذیری کی صلاحیت ہو۔ غور کرو جو ہستی یوسف اور اس کے بھائیوں کے ساتھ یہ معاملہ کر سکتی ہے وہ محمدؐ کے اور تمہارے ساتھ یہ معاملہ نہیں کر سکتی۔ چناں چہ اگر وہ چاہے تو پہلے محمدؐ کو یہاں سے نکال دے پھر ان کو زمین میں غلبہ و تمکن عطا کر دے پھر اتباع واصحاب سے ان کی تائید کر کے تمہیں مغلوب کر دے''۔[۲۷]

اس کے بعد امام ابن جریرؒ نے اس روایت کا ذکر کیا ہے جو مجاہد سے مروی ہے۔ روایت یہ ہے۔

"عن محمد بن عمرو قال ثنا أبو عاصم قال ثنا عيسىٰ
عن أبی نجيح عن مجاهد فی قوله "لقد كان فی قصصهم
عبرة" ليوسف واخوته"۲۸

اس کے بعد فرمایا کہ یہ مجاہدؒ کا قول ہے اور اس تاویل کا بھی ایک محل ہے لیکن جو تاویل ہم نے اوپر کی ہے وہ اس سے بہتر ہے کیوں کہ محمد ﷺ اور ان کے مشرک قوم کے حالات بیان کرنے اور مشرکوں کے شرک وکفر پر وعید اور تہدید کے بعد یہ فرمایا گیا ہے کہ

"لقد كان فی قصصهم عبرة لأولی الالباب"۲۹

یہاں امام ابن جریر طبریؒ جیسے تفسیر بالماثور کے نمائندہ امام نے بھی نظم کلام کی رعایت سے آیت کی تاویل کی اور روایت کو نقل کرنے کے بعد اس کی آیت سے عدم مطابقت کی وجہ سے اس سے استدلال کو درست نہیں سمجھا۔

۵۔ کسی لفظ کے اس معنیٰ کو ترجیح حاصل ہوگی جو لغت کے لحاظ سے زیادہ ثابت شدہ ہو کیوں کہ جو معنی کلام عرب میں زیادہ مستعمل ہو اسے چھوڑنا درست نہیں، الا آں کہ وہ نظم کلام، استعمالات قرآن اور دینی عقائد کے خلاف ہو۔ علامہ فراہیؒ نے اس کی مثال میں "نزاعة للشوی" کو پیش کیا ہے۔ اس میں لفظ "الشوی" کے معنی کے تعین میں علامہ عبدالقادر دہلویؒ سے غلطی ہوئی ہے اور مفسرین کی ایک بڑی جماعت اس غلطی کا اعادہ ایک تسلسل کے ساتھ کرتی چلی آرہی ہے۔ علامہ دہلوی نے "الشوی" کا معنیٰ "کلیجہ" لکھا ہے۔ یعنی "وہ کھینچ لینے والی ہے کلیجہ کو" حالاں کہ کلام عرب میں یہ عام طور سے "لحم الساق" پنڈلی کے گوشت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ جہنم میں ڈالے جانے کے بعد کی کیفیت کا بیان نہیں ہے بلکہ عذاب سے قریب ہونے کے مرحلہ کا بیان ہے۔ بتایا جارہا ہے کہ جس دن جنت متقیوں کے قریب لائی جائے گی اور جہنم سرکشوں کے لیے بے نقاب کردی جائے گی اس وقت ان کا کوئی ساتھی ومددگار نہ ہوگا۔ جہنم کافروں کو بلائے گی اور اپنے شعلے اگلے گی جو دور ہی سے ان کی پنڈلیوں کے گوشت ادھیڑ دیں گے۔۳۰

جہاں تک ان کے کلیجے نکال لینے والی بات کا تعلق ہے تو قرآن مجید میں اس کا

کوئی اشارہ تک نہیں ہے یہاں تک کہ جب وہ جہنم میں داخل ہوں گے تب بھی شعلہ جہنم کے ان کے کلیجے اور دل نکال لینے کا کوئی ذکر قرآن میں ہے نہ حدیث میں۔

علامہ فراہیؒ فرماتے ہیں کہ اسی طرح جن لوگوں نے "الشوی" کے معنی سر کی کھال کے لیے ہیں انھوں نے بھی غلطی کی ہے کیوں کہ کلام عرب میں یہ لفظ "لحم الساق" کے معنی میں معروف ہے "جلد الراس" کے معنی میں نہیں۔ "جلد الراس" کے معنی میں اس کا استعمال ہے مگر بہت کم اور وہ بھی دوسرے معانی کے احتمال کے ساتھ۔ علاوہ ازیں قرآن وحدیث میں کہیں یہ ذکر نہیں ملتا کہ کفار ومشرکین سر کے بل جہنم میں داخل کیے جائیں گے کہ ان کے سر کے بال یا کھال جھلسنے کی بات کہی جائے۔ اور اگر بالفرض اس کے دو معانی یکساں طور سے معروف ہوتے جب بھی اختیار اسی کو کرنا چاہیے تھا نظم کلام جس کے زیادہ موافق ہو اور قرآن کے دوسرے مقامات سے جس مفہوم کی زیادہ تائید ہوتی ہو۔ لیکن یہاں ایسا نہیں ہے۔۳۱

باطل اصول

علامہ فراہی کے نزدیک ایسے تمام اصول باطل ہیں جو قرآن وسنت کی روح کے منافی ہوں۔ اس ضمن میں جہاں وہ ایک طرف نصوص شرعیہ کے مقابلے میں عقل ودانش کے استعمال کو باطل قرار دیتے ہیں وہیں قرآنی آیات کی تاویل میں روایات وآثار کو اصل قرار دے کر قرآن کریم کو ان کے مطابق ڈھالنے کو بھی صحیح نہیں سمجھتے ہیں۔

علامہ فراہیؒ فرماتے ہیں کہ کتنی ہی آیات قرآنی ہیں جن کی تائید احادیث سے ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں روایات کی تائید یقیناً پیش کی جانی چاہیے۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ احادیث قرآن کی شرح وتفسیر ہیں، قرآن پر اضافہ نہیں ہیں اس لیے احادیث کو قرآن پر حکم بنانا درست نہیں ہے "قرآن کی تفسیر حدیث سے" کی ایک بہترین مثال ہے یہ آیت کہ "ابائكم و ابنائكم لا تدرون ايهم اقرب لكم نفعا فريضة من الله" (النساء:۱۱) یعنی تم اپنے باپوں اور بیٹوں کے متعلق نہیں جان سکتے کہ تمہارے لیے

زیادہ نافع کون ہوگا؟ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا فریضہ ہے۔

سورہ نساء کے اس پورے سلسلۂ کلام میں اللہ تعالیٰ نے وصیت کے باب میں اپنی واضح ہدایات دے دی ہیں قرآن نے یہاں یہ تنبیہ بھی فرمادی ہے کہ یہ تقسیم اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی حکمت پر مبنی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس ہدایت کو اپنی وصیت سے تعبیر فرمایا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اس کی بہت عمدہ شرح فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جن کو اس نے کسی مورث کا وارث قرار دیا ہے ان کے لیے وصیت کرتا ہے تو درحقیقت یہ خدا کی وصیت کی اصلاح بلکہ صحیح تر الفاظ میں اس کی مخالفت ہوئی جو تقویٰ کے بالکل منافی ہے۔ اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ موروثوں کو وصیت کی جو اجازت دی گئی ہے اس کا تعلق ان وارثوں سے نہیں ہے جن کے باب میں خود خدا کی وصیت موجود ہے۔ بلکہ یہ غیر وارثوں کے لے خاص ہے۔ چناں چہ اسی بنیاد پر نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ''لا وصیة لوارث''۔[۳۲]

یہاں دیکھیے قرآن کے ایک حکم کی تائید میں ایک حدیث کا حوالہ بھی علامہ فراہیؒ نے دیا ہے اور مولانا اصلاحیؒ نے بھی۔ علامہ فراہیؒ کا خیال ہے کہ احادیث سے استدلال مستحسن ہے لیکن صحیح طریقہ یہ ہے کہ تم راہ ہدایت قرآن سے سیکھو اور اسی پر اپنے دین کی بنیاد رکھو اس کے بعد ذخیرۂ احادیث پر نظر ڈالو اور اگر کوئی روایت قرآن سے متصادم نظر آئے تو اس روایت کی تاویل قرآن کی روشنی میں کرو۔ اب اگر دونوں میں مطابقت پیدا ہو جاتی ہے تو تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور اگر دونوں میں مطابقت پیدا نہ ہو سکے تو حدیث کے باب میں توقف کرو۔ اور قرآن پر عمل کرو۔[۳۳]

علامہ فراہیؒ فرماتے ہیں کہ چوں کہ اس اصل پر سارے علماء کا اتفاق ہے کہ ''القرآن یفسر بعضه بعضا'' اس لیے ناگزیر ہے کہ اسے سب پر راجح قرار دیا

جائے۔ پھر یہ بھی تو دیکھو کہ جب دو حدیثوں میں تعارض ہوتا ہے تو لوگ اس حدیث کو ترجیح دیتے ہیں جس کی سند زیادہ قوی ہوتی ہے۔ پھر یہی اصول قرآن و حدیث کے درمیان تعارض کی صورت میں بھی برتا جانا چاہیے کیوں کہ متن قرآن کی سند متون احادیث سے کہیں زیادہ قوی ہے۔[۳۴]

حواشی و مراجع

۱۔ الامام حمید الدین فراہی، رسائل الامام الفراهی (رسالہ التکمیل فی اصول التاویل) باب ۴۔ ملتزم النشر والتوزیع الدائرۃ الحمیدیہ بمدرسۃ الاصلاح سرای میر، اعظم گڑھ۔ الطبعة الثانیة ۱۴۱۱ھ، ص ۲۱۵

۲۔ حوالہ سابق، ص ۲۱۵-۲۱۶

۳۔ شیخ الاسلام الامام ابن تیمیہ، مجموع فتاوی شیخ الاسلام۔ دار العربیہ، بیروت۔ ۱۳۹۸ھ۔ ج ۱۳، ص ۳۷۰-۳۷۱

۴۔ حوالہ سابق، ص ۳۷۴

۵۔ رسائل الامام الفراهی، بحث فرض التدبر والتفکر فی کتاب اللہ ص ۲۱۸

۶۔ ملاحظہ ہوں مندرجہ ذیل آیات:
افلا یتدبرون القرآن (النساء:۸۲)، افلا یتدبرون القرآن أم علی قلوب اقفالها (محمد:۲۴) افلم یدبروا القول أم جاء هم مالم یات اباء هم الاولین (المومنون:۶۸) کتاب انزلناه إلیک مبارک لیدبروا ایاته ولیتذکر اولو الالباب (ص:۲۹)۔

۷۔ محمد بن اسماعیل البخاری، صحیح البخاری۔ کتاب العلم۔ باب طرح الامام المسالۃ علی اصحابہ لیختبر ما عندہم من العلم۔ مکتبہ مصطفائی۔ دیوبند۔

۸۔ ایضاً باب القراۃ والعرض علی المحدث۔

۹۔ الامام ابو جعفر محمد بن جریر الطبری۔ ضبط و تعلیق: محمد شاکر، تصحیح علی عاشور۔ دار احیاء

التراث العربی۔ بیروت لبنان۔ الجزء العشرون۔ تفسیر سورۃ النصر۔

۱۰۔ رسائل الامام الفراھی ص۲۲۰-۲۲۱

۱۱۔ حوالہ سابق ص۲۲۳

۱۲۔ رسائل الامام الفراھی ص۲۲۸

۱۳۔ حوالہ سابق ص۲۲۹

۱۴۔ حوالہ سابق، ص۲۳۹تا۲۶۱

۱۵۔ علامہ حمید الدین فراہیؒ۔ تفسیر نظام القرآن۔ ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی شائع کردہ دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح۔ ص۳۱

۱۶۔ حوالہ سابق، ص۳۱

۱۷۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے ترجمہ کیا ہے ''ہر آئینہ کج شدہ است دل شما'' شاہ رفیع الدین نے لکھا ہے'' کج ہو گئے دل تمہارے'' شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے ترجمہ کیا ہے''اگر تم دونوں توبہ کرتی ہو تو جھک پڑے ہیں دل تمہارے'' اس پر مولانا شبیر احمد عثمانی کی تشریح وہی ہے جو عام طور سے لوگ کرتے ہیں، مولانا محمد جوناگڑھی نے ترجمہ کیا ہے''اگر تم دونوں اللہ کے سامنے توبہ کرلو تو بہت بہتر ہے، یقیناً تمہارے دل جھک پڑے ہیں، اور تشریح انھوں نے بھی یہی کی ہے۔

۱۸۔ تفسیر نظام القرآن، سورۂ تحریم، ص۱۷۷۔

۱۹۔ تفسیر نظام القرآن۔ سورۂ تحریم، ۱۷۸-۱۷۹

۲۰۔ تفسیر نظام القرآن۔ سورہ عبس ص۲۶۲،

۲۱۔ مولانا امین احسن اصلاحی تفسیر تدبر قرآن، ج۹ تفسیر سورہ عبس ص۱۹۱۔

۲۲۔ ملاحظہ ہو سورۃ البقرۃ آیات ۱۲۹، ۲۰۹، ۲۲۰، ۲۲۸، ۲۴۰، ۲۶۰۔

۲۳۔ دیکھیے سورۂ آل عمران: ۴، سورۃ المائدہ: ۹۵۔

۲۴۔ دیکھیے سورۃ الانعام: ۹۶

۲۵۔ الملک القدوس السلام المؤمن المھیمن العزیز الجبار۔ سورۃ الحشر: ۲۳۔

۲۶۔ ملاحظہ ہو سورۃ الجمعۃ: ۱۔ الملک القدوس العزیز الحکیم۔

۲۷۔ تفسیر طبری، تفسیر سورہ یوسف۔

۲۸۔ بحوالہ تفسیر طبری۔

۲۹۔ تفسیر طبری تفسیر سورہ یوسف۔

۳۰۔ ملاحظہ ہو سورۃ المعارج آیات: ۱تا۱۸۔

۳۱۔ رسائل الامام الفراہی۔ رسالۃ التکمیل فی اصول التاویل، ص۲۷۲-۲۷۳۔

۳۲۔ تفسیر تدبر قرآن، ۲، تفسیر سورۃ النساء: ۱۱ص۲۶۱۔

۳۳۔ رسائل الامام الفراہی ص۲۷۵-۲۷۶

۳۴۔ ایضاً ص۲۷۸

☆